قسط نمبر 3

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کے

تفسیری اصولوں کا جائزہ

تحریر: مولانا حافظ صلاح الدین یوسف (مشیر وفاقی شرعی عدالت پاکستان)

قدیم آسمانی صحیفے؛ تدبر قرآن کا اہم ماخذ

تفسیر ''تدبر قرآن'' کا ایک امتیاز یہ بھی ہے جو ایک بڑا تضاد بھی ہے کہ احادیث سے استفادے کی اہمیت کو تو (زبان کی حد تک) اصلاحی صاحب نے تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ان کو مشکوک ٹھہرانے میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی جس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ غیر محفوظ ہیں۔ ان کے اس دعوے کی بابت ہم (قرآن کریم کے الفاظ میں) یہی کہیں گے: ﴿مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾ [الکہف: ۵] ''نہیں ہے ان کو اس بارے میں کوئی علم اور نہ ان کے باپ دادا (پیش رو منکرین حدیث) ہی کو تھا، بڑی ہے وہ بات جو ان کے منہوں سے نکلتی ہے (کیونکہ) وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' لیکن تعجب ہے کہ وہ قدیم آسمانی صحیفوں کو بھی غیر محفوظ اور تحریف شدہ سمجھتے ہیں جیسا کہ مبادی تدبر حدیث سے ہم ان کا یہ اعتراف پہلے نقل کر آئے ہیں اور تفسیر میں بھی کئی جگہوں پر اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ''تدبر قرآن'' میں ان کو بڑی اہمیت دی ہے اور جگہ جگہ ان سے استشہاد کیا ہے اور مقدمہ تفسیر میں ان کی بابت حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے:

''یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اسی طرح تورات، زبور اور انجیل بھی اللہ ہی کے اتارے ہوئے صحیفے ہیں۔ اگر ان کے بدقسمت حاملوں نے ان صحیفوں میں تحریفیں نہ کر دی ہوتیں تو یہ بھی اسی طرح ہمارے لیے رحمت و برکت تھے جس طرح قرآن ہے۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود آج بھی ان کے اندر حکمت کے خزانے ہیں اگر آدمی ان کو پڑھے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح سامنے آتی ہے کہ ان صحیفوں کا سرچشمہ بھی بلاشبہ وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ میں بار بار اُن کو پڑھنے کے بعد اس رائے کا اظہار کرتا ہوں کہ قرآن کی حکمت کے سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ مدد مشکل ہی سے کسی دوسری

چیز سے ملتی ہے، خاص طور پر زبور، امثال اور انجیلوں کو پڑھیے تو ان کے اندر ایمان کو وہ غذا ملتی ہے جو قرآن و حدیث کے سوا اور کہیں بھی نہیں ملتی۔'' [مقدمہ تفسیر، ص: د]

اس اقتباس کی روشنی میں ہم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان صحیفوں کے حاملین (یہود و نصاریٰ) تو یقیناً بدقسمت تھے اور ہیں، لیکن اصلاحی صاحب اور ان کے ہم نوا ''خوش قسمت'' ہیں کہ انہوں نے حکمت قرآن کے اصل سر چشمے، حدیث رسول سے تو (جو قرآن ہی کی طرح محفوظ ہے) اعراض و گریز کیا ہے اور غیر محفوظ و محرف سرچشموں (تورات و انجیل) سے قرآن کی ''حکمت'' کے سمجھنے میں بھی مدد حاصل کی ہے اور ایمان کی غذا بھی حاصل کی ہے، سبحان اللہ

یہ نصیب اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے

بہر حال اس اقتباس سے ہمارا مقصود اس پہلو کی وضاحت ہے کہ ''تدبر قرآن'' میں قرآن کی جو ''حکمتیں'' بیان ہوئی ہیں وہ غیر محفوظ اور محرف کتابوں سے ماخوذ ہیں اور اس روشنی سے محروم ہے جس سے تمام مفسرین امت قرآن کے سمجھنے میں مدد حاصل کرتے رہے ہیں۔

اپنی اپنی فکر اور اپنی اپنی سمجھ ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار
فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست

''تدبر قرآن'' کا ماخذ اوّل؛ کلام عرب:

تفسیر کے اصول بیان کرتے ہوئے اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''پہلا اصول یہ ہے کہ تفسیر کا اوّل ماخذ اس زبان کو بنایا جائے جس زبان میں قرآن مجید اُترا ہے......اس کیلئے آپ کو امرؤ القیس، لبید، زہیر، عمرو بن کلثوم اور حارث بن حلزہ وغیرہ اور عرب کے خطبائے جاہلیت کے کلام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور اس کلام کی آپ کو اس حد تک ممارست بہم پہنچانی پڑے گی کہ آپ اس کے اصلی و نقلی میں امتیاز کر سکیں، اس کے اسالیب و محاورات کو اچھی طرح سمجھ سکیں، اس کے حسن و قبح کو معین کر سکیں، اس کے اندازِ ایجاد و اطناب کو معلوم کر سکیں، اس کی تلمیحات و اشارات سے محظوظ ہو سکیں۔'' [مبادی تدبر قرآن، ص: ۱۹۱، ۱۹۲]

قرآن کی تفسیر اور اس کے فہم کیلئے عربی زبان کی اہمیت مسلمہ ہے، بلاشبہ یہ شرط اوّل ہے لیکن اس میں مہارت کیلئے زمانہ جاہلیت کے شعراء وخطباء ہی کے کلام میں اتنی ممارست کو ضروری قرار دینا، جس کیلئے موصوف نے اتنی شاعرانہ خیال آرائی فرمائی ہے، قطعاً ناممکن ہے۔حتیٰ کہ خود موصوف بھی اس معیار پر پورے نہیں اترتے، جیسا کہ ان کے فاضل سوانح نگار ڈاکٹر عزمی نے اس کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے۔(ملاحظہ ہواُن کی کتاب ''مولانا امین احسن اصلاحی؛ حیات وافکار''، ص:۱۸۸۔۱۹۱]

خود اصلاحی صاحب بھی مذکورہ عبارت آرائی کے بعد فرماتے ہیں: ''ظاہر ہے یہ کام ہے بہت مشکل۔لیکن جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ جب تک اس مشکل کو اپنے لیے آسان نہیں بنائیں گے، وہ قرآن مجید کے فہم میں تفسیروں اور ترجموں کی خوشہ چینی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' [حوالہ مذکور، ص:۱۹۲]

کون مسلمان ہے، بالخصوص قرآن کریم کے سمجھنے کا جذبہ رکھنے والا، جو عربی زبان میں ممارست کا مذکورہ ہفت اقلیم طے کر سکے؟ پھر تو قرآن فہمی ایسا سمندر ہے جس کی غواصی کرنے پر کوئی مشکل ہی سے قادر ہو سکے گا، ایک عنقا ہے جس کا خارج میں وجود ہی نہیں ہے اور انسانوں اور قرآن کے درمیان ایسی وسیع خلیج حائل ہے جس کو پاٹنا یا عبور کرنا ناممکن ہے۔

علاوہ ازیں اس میں ایک اور مشکل ہے اور وہ بھی ہمارے خیال میں ناقابلِ حل ہے، وہ بھی آپ اصلاحی صاحب ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔موصوف ایک دوسرے مقام پر مذکورہ نکتے ہی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''قابل اعتماد چیز اس باب میں کلامِ عرب ہی ہے۔لفظ کے اصلی حقائق اسی سے کھلتے ہیں، پھر اسالیب کلام کا معاملہ تو سرتا سر اسی سے متعلق ہے......لیکن کلام عرب میں بھی اصلی اور نقلی دونوں ہیں۔آدمی کو ایک عرصے کی مشق کے بعد۔اگر ذوق اچھا ہو۔اصلی ونقلی کے مابین امتیاز ہوتا ہے اور یہ امتیاز نہایت ضروری ہے، ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بالکل شاذ اور غیر معروف معنیٰ کو اختیار کر لیتا ہے اور معروف معنیٰ کو چھوڑ دیتا ہے۔'' [حوالہ مذکورہ، ص:۶۷]

یہ دوسری مشکل کہ کلام عرب میں اصلی اور نقلی کے درمیان امتیاز کرنا، یہ بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔کیونکہ سرے سے اس کی تحقیق ہی نہیں کی گئی ہے کہ عربی کا جاہلی ادب، جس کو کلام عرب کا نام دیا گیا ہے، اس کا فلاں فلاں حصہ اصلی ہے اور فلاں فلاں حصہ نقلی ہے تو اس سے استفادے سے پہلے یہ امتیاز

کس طرح کیا جائے گا؟ موصوف کا فرمانا ہے کہ اچھے ذوق کا حامل شخص ایک عرصے کی مشق کے بعد یہ امتیاز کر سکتا ہے لیکن یہ بات یکسر نا قابل فہم ہے کہ محض حسن ذوق کی تھوڑی سی مشق سے یہ ہفت خواں طے ہوسکتا ہے؟ بالخصوص جبکہ اس کے نہ کوئی اصول وضوابط ہیں اور نہ ہی اس کلام کا کوئی حصہ یا کوئی دور متعین ہے۔

احادیث کی تحقیق وتنقید کے اصول وضوابط مقرر ہیں اور محدثین نے ان اصولوں پر پرکھ کر ایک بہت بڑی تعداد میں صحیح احادیث کو ضعیف احادیث سے الگ بھی کر دیا ہے، ان کے مجموعے بھی مرتب کر دیئے ہیں۔ نیز ان اصولوں کو بروئے کار لا کر دیگر احادیث کی تحقیق وتنقیح بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اصلاحی صاحب کے نزدیک پھر بھی احادیث ظنی ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور کلام عرب میں اصلی ونقلی کے درمیان امتیاز کرنا ہی کارے دارد ہے، پھر بھی وہ قرآن فہمی میں سب سے مقدم اور سب سے زیادہ اہم ہے!

کیسا عجیب انصاف یا تحقیق ہے! دراصل یہ ''حبِ علی رضی اللہ عنہ نہیں، بغض معاویہ رضی اللہ عنہ'' والا معاملہ ہے۔ کلامِ عرب پر یہ زور، باوجود کہ اس کا کوئی صحیح مجموعہ دنیا میں موجود نہیں، حدیث دشمنی کا شاخسانہ اور قرآن فہمی میں حدیث کے بنیادی کردار کا انکار ہے۔

اصلاحی صاحب کا کلام عرب پر زور اور اس میں ممارست کا دعویٰ؟

اصلاحی صاحب نے کلامِ عرب کی اہمیت کا یہ صور اتنی بلند آہنگی سے اس لیے پھونکا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس بلند مقام پر فائز سمجھتے ہیں اور انہوں نے اس میں اتنی ممارست بہم پہنچالی ہے کہ وہ اصلی اور نقلی (منحول) کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے سوانح نگار ڈاکٹر عزمی ہی نے مثالیں دے کر ان کے اس دعوے کا بطلان واضح کر دیا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا ہے، اہل علم وتحقیق اس کتاب کی مراجعت کر کے اس مبحث کو دیکھ سکتے ہیں۔

ہمارا مقصود چونکہ صرف ان کی احادیث سے بے اعتنائی یا اس سے دشمنی کی وضاحت ہے، اس لیے ہم اپنی گفتگو اس پہلو ہی پر مرکوز رکھیں گے۔ بنا بریں ہم یہاں ان کے اس ''امتیاز'' کی حقیقت واضح کرنے کیلئے صرف دو مثالیں پیش کریں گے جن سے یہ نمایاں ہو جائے گا کہ موصوف کا کلام عرب کے سمجھنے میں بھی کسی ممتاز مقام پر فائز ہونے کا دعویٰ محل نظر ہے۔ ان کی مشہور کتاب ہے: ''پاکستانی عورت، دوراہے پر'' ہمارے سامنے اس کا پہلا ایڈیشن ہے، اس میں تاریخ اشاعت درج نہیں ہے، صرف بار اوّل لکھا ہے۔ البتہ

مؤلف کے دیباچے کے آخر میں اگست ۱۹۵۰ء کی تاریخ درج ہے۔اس میں حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ ''وہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئیں اور کہا کہ ہم عورتوں کا حال یہ ہے کہ ہم پردوں کے اندر رہنے والی اور گھروں کے اندر بیٹھنے والی ہیں، ہمارا کام یہ ہے کہ مرد ہم سے اپنی خواہشِ نفس پوری کر لیں اور ہم ان کے بچے لادے لادے پھریں۔ مرد جمعہ و جماعت، جنازہ و جہاد ہر چیز کی حاضری میں ہم سے سبقت لے گئے۔ وہ جب جہاد میں جاتے ہیں تو ہم ان کے گھربار کی حفاظت کرتی اور ان کے بچوں کو سنبھالتی ہیں تو کیا اجر میں بھی ان کے ساتھ ہم کو حصہ ملے گا؟''

آنحضرت ﷺ ان کی یہ فصیح و بلیغ تقریر سننے کے بعد صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم نے ان سے زیادہ بھی کسی عورت کی عمدہ تقریر سنی ہے جس نے اپنے دین کی بات سوال کیا ہو؟ تمام صحابہ نے قسم کھا کر اقرار کیا کہ نہیں یارسول اللہ ﷺ! اس کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت اسماء کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے اسماء! میری مدد کر اور...... عورتوں کو میرا یہ جواب پہنچا دو کہ تمہارا اچھی طرح خانہ داری کرنا، اپنے شوہروں کو خوش رکھنا اور ان کے ساتھ سازگاری کرنا، مردوں کے ان سارے کاموں کے برابر ہے جو تم نے بیان کیے ہیں...... الخ''۔

یہ واقعہ ابن عبدالبر کی کتاب ''**الاستیعاب فی معرفة الأصحاب**'' کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے جو صحابہ وصحابیات کے حالات پر مشتمل ہے۔اس میں ''اے اسماء! میری مدد کر'' کے الفاظ قابل غور ہیں۔ روایت میں اصل عربی الفاظ ہیں ''**انصرِ فِي**'' (جاؤ اور......) لیکن اصلاحی نے اس کو **انصُرْنِيْ** '' سمجھ کر اس کا ترجمہ کیا ہے: ''میری مدد کر۔'' [الاصابۃ مع الاستیعاب: ۲۳۸/۴]

اصلاحی صاحب کا دعویٰ ہے کہ جتنا جاہلی ادب ان کو دستیاب ہوا ہے، وہ سب انہوں نے پڑھا ہے۔اسی لیے وہ اس جاہلی ادب یا کلام عرب کو اوّلین ماخذ قرار دیتے ہیں اور اس میں اپنی ممارست کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن ایک آسان سی عربی عبارت کو بھی وہ پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے!

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عربی دانی کے زعم میں احادیث کو ٹھکرا کر یہ کہے کہ قرآن فہمی میں حدیث نہیں، بلکہ کلام عرب کی اہمیت زیادہ ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسی کے مطابق وہ پورے قرآن کی تفسیر بھی کرے! ایسی تفسیر مکتب اہل سنت میں کسی اہم مقام کی حامل ہو سکتی ہے جبکہ اہل سنت

کے نزدیک احادیث وآثار ہی تفسیر قرآن میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں!

ایک دوسری مثال، لفظ "تقتیل" کا مفہوم ومطلب:

آیت محاربہ میں محاربین کی ایک سزا "تقتیل" بھی بتلائی گئی ہے: ﴿اَنْ يُّقَتَّلُوْا﴾[المائدة: ۳۷]

لفظ "تقتیل" سے فراہی گروہ نے (اصلاحی صاحب سمیت) دو چیزوں کا اثبات کیا ہے: ایک اوباشی اور غنڈہ گردی کی سزا، دوسری سنگساری کی سزا۔

ہمارا سوال ہے کہ کلام عرب میں سے کوئی ایک مثال پیش کر دی جائے جس میں "تقتیل" کے مفہوم میں یہ دو چیزیں شامل ہوں۔ اگر ایسا نہیں کیا جا سکتا (اور یقیناً نہیں کیا جا سکتا!) تو پھر مان لینا چاہیے کہ آیت محاربہ میں لفظ "تقتیل" کی یہ تفسیر فراہی واصلاحی وغامدی، جس طرح تمام مفسرین امت کی متفقہ تفسیر کے خلاف ہے اسی طرح یہ کلام عرب کے بھی خلاف ہے۔

فراہی گروہ کا نظریۂ رجم:

اس گروہ کا نظریۂ رجم کیا ہے؟ اس پر ہم نے الحمدللہ اپنی کتاب "حد رجم کی شرعی حیثیت" (مطبوعہ ۱۹۸۱ء) اور "فتنۂ غامدیت" (مطبوعہ جولائی ۲۰۱۵ء) میں قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔ اسی طرح چوہدری رفیق صاحب کی کتاب ہے۔ اصلاحی صاحب کے سوانح نگار ڈاکٹر عزمی نے بھی اپنی کتاب میں بڑی عمدہ بحث اور فراہی موقف پر بڑی جاندار تنقید کی ہے۔[ملاحظہ ہو صفحات: ۱۹۵۔۲۱۲]

تاہم یہ بات ہمارے لیے ناقابلِ فہم اور نہایت تعجب انگیز ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اتنی مدلل بحث کے بعد "خلاصۂ بحث" کا عنوان قائم کر کے اور اس میں سزائے رجم کو بہرحال قابلِ غور وفکر قرار دے کر اپنے مؤقف کی خود ہی تردید کر دی اور بعض دوسرے منکرین رجم کی آراء بھی نقل کر دی ہیں، انا للہ و انا الیہ راجعون. یہ ﴿نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا﴾[النحل: ۹۲] کی نہایت عبرت ناک مثال ہے۔ فنعوذ باللہ من الحور بعد الکور. ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾[آل عمران: ۸]

فراہی نظریۂ رجم پر ہمارے چند سوالات

بہرحال دلائل کے ذریعے سے فراہی مؤقف کا بطلان واضح کیا جا چکا ہے اور مذکورہ کتابوں میں ان

کے ''دلائل'' کے تار و پود بکھیر دیئے گئے ہیں۔ **فللّٰہ الحمد علی ذلک**. اس لیے ہم یہاں اس گروہ سے صرف چند سوالات کر کے آگے چلیں گے۔ اصلاحی صاحب نے اپنے مقدمہ تفسیر کے آخر میں لکھا ہے:

''کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی آیت کو اس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کیلئے استعمال کروں۔'' [آخری صفحہ]

ان کے اس دعوے کی روشنی میں ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ کیا امت کی چودہ سو سالہ علمی وتفسیری تاریخ میں فراہی نظریۂ رجم کسی نے پیش کیا ہے؟ (خیال رہے کہ خوارج نے حد رجم کا انکار کیا ہے، وہ تاریخی طور پر ثابت ہے لیکن فراہی نظریہ، رجم کا انکار نہیں ہے، اس کا بطور حد انکار ہے۔ اس کا حوالہ مطلوب ہے)

دوسرا سوال ہے کہ کیا آیت محاربہ کے لفظ ﴿اَنْ یُّقَتَّلُوْا﴾ سے فراہی گروہ سے پہلے کسی نے رجم کا اثبات کیا ہے؟ یعنی ''تقتیل'' کا مفہوم رجم بھی ہوسکتا ہے؟

تیسرا سوال ہے کہ کیا ''تقتیل'' کے مفہوم میں جاہلی ادب میں، جو قرآن فہمی میں ان کے نزدیک ماخذ اوّل ہے، کسی نے رجم مراد لیا ہے؟ کسی عربی لغت میں اس کا یہ مفہوم لیا گیا ہے؟

چوتھا سوال ہے کہ کیا اسلام میں اوباشی اور غنڈہ گردی کی مستقل سزا کا وجود ہے؟ بلاشبہ ایسے لوگوں کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے، حاکم وقت یا قاضی کو جرم کی نوعیت کے مطابق مجرم کو تعزیری سزا دینے کے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اوباشی کی یہ سزا رجم ہی کیوں ہو؟ تعزیری سزا میں رجم کی تخصیص کی دلیل کیا ہے؟ تخصیص سے یہ تعزیری سزا تو نہ ہوئی، ایک مخصوص حد ہوگئی۔ یہ تخصیص کسی نص شرعی کے بغیر کس طرح ہوسکتی ہے؟

پانچواں سوال ہے کہ '' تقتیل'' کو اگر شر تقتیل کے مفہوم کا حامل سمجھ کر اس سے رجم کا مسئلہ کشید کیا جا سکتا ہے تو پھر اس سے ''مُثلہ'' کرنے کا جواز بھی کشید کیا جا سکتا ہے۔ فراہی گروہ احادیث رجم کا انکار کر کے اگر اس سے رجم کا اثبات (بطور تعزیر) کرسکتا ہے تو کوئی دوسرا شخص ''مُثلہ'' کرنے کی ممانعت والی احادیث کا انکار کر کے اس لفظ سے ''مُثلہ'' کا جواز کیوں ثابت نہیں کرسکتا؟

جب تمام اصول وضوابط کو نظر انداز کر کے اور احادیث صحیحہ کا انکار کر کے قرآن سے اپنے خودساختہ نظریے کا اثبات کرنا جائز اور صحیح ہے تو پھر یہ حق صرف فراہی گروہ ہی کو کیوں حاصل ہو، دوسرا کوئی شخص یہ حق

کیوں استعمال نہیں کرسکتا؟ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں احادیث کو ظنی اور مشکوک قرار دے کر محض کلامِ عرب کے ذریعے سے تفسیر کرنا، شعوری یا غیر شعوری طور پر دین کو بازیچۂ اطفال بنانا ہے۔

چھٹا سوال ہے کہ اصلاحی صاحب نے اس بات کی نفی کی ہے انہوں نے اپنے کسی نظریے یا خیال کی تائید کیلئے کسی آیت کو استعمال کیا ہے، اگر یہ سچ ہے تو پھر فراہی گروہ ثابت کرے کہ ''تقتیل'' کے لفظ سے فراہی نظریۂ رجم کا اثبات، فراہی گروہ کا خود ساختہ نظریہ یا خیال نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے فلاں فلاں عالم یا مفسر یا فقیہ نے بھی یہ نظریہ پیش کیا ہے۔ اگر یہ گروہ یہ حوالہ پیش نہیں کرسکتا تو پھر ظاہر ہے کہ زیر بحث نظریۂ رجم فراہی گروہ کا خانہ ساز اور خود ساختہ ہے۔ اصلاحی صاحب مذکورہ دعویٰ کیونکر کر سکتے ہیں جبکہ انہوں نے اپنے خود ساختہ نظریۂ رجم کیلئے آیت محاربہ کے لفظ ''تقتیل'' کو استعمال کیا ہے اور اس میں اپنے خود ساختہ نظریۂ رجم کو داخل کیا ہے۔

ساتواں سوال ہے کہ کیا قرآن کریم میں ایک جرم کی سزا دو دو جگہ بیان ہوئی ہے؟ قرآن کی آیت ﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا﴾[المائدۃ: ۳۸] میں چوری کی سزا بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح آیت ﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا......﴾[النور: ۲] میں زنا کی سزا کا بیان ہے۔ (یہ الگ بحث ہے کہ حدیث کی رو سے اس کے عموم میں تخصیص کردی گئی ہے، اس اعتبار سے اس میں صرف غیر شادی شدہ زانیوں کی سزا کا بیان ہے) کیا چوری اور کنوارے زانی کیلئے زنا کی سزا، ان دو آیات کے علاوہ کسی اور جگہ بھی بیان ہوئی ہے؟ اسی طرح آیت محاربہ میں محاربہ کی سزا بیان ہوئی ہے، کیا محاربہ کی یہ سزا کسی اور آیت میں بھی بیان ہوئی ہے؟ و هلم جرا۔ عام زانیوں کے علاوہ ''پیشہ ور'' زانیوں کیلئے اگر الگ سزا ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور بیان فرما دیتا یا اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعے سے اس کی سزا مقرر فرما دیتا جیسے شادی شدہ کی سزا (حدرجم) اپنے پیغمبر ﷺ ہی کے ذریعے سے مقرر فرمائی ہے۔

کیا حضرت ماعز اور غامدیہ سزائے محاربہ کے مصداق ہو سکتے ہیں؟

آٹھواں سوال ہے کہ ''محاربہ'' کیا ہے؟ کیا محاربہ کی تعریف میں پیشہ ور زانی یا اوباش قسم کے لوگ آتے ہیں؟ محاربہ کی تعریف اگر ہم یا کسی اور کی بیان کردہ تعریف بیان کریں گے تو شاید فراہی گروہ کے نزدیک قابل قبول نہ ہو۔ اس لیے ہم ''تدبر قرآن'' ہی کی بیان کردہ تفصیل کی روشنی میں اس نکتے کی

وضاحت کرنا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، چنانچہ اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

''اللہ اور رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظام حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول ﷺ نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوششیں اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہوں تو اس کیلئے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کیلئے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔

قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے تحت کاروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے۔ اپنے شر و فساد سے علاقے کے نظم کو درہم برہم کر دے، لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، تہریب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کیلئے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کیلئے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے:

﴿اَنْ يُقَتَّلُوْا﴾ یہ کہ فساد فی الارض کے یہ مجرمین قتل کر دیئے جائیں۔ یہاں لفظ ''قتل'' کی بجائے ''قتیل'' باب تفعیل سے استعمال ہوا ہے۔ باب تفعیل معنی کی شدت اور کثرت پر دلیل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ''تقتیل''، شر تقتیل کے معنی پر دلیل ہوگا۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقے پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق ملے، صرف وہ طریقہ قتل اس سے مستثنٰی ہوگا جو شریعت میں ممنوع ہے، مثلاً آگ میں جلانا، اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو گنڈوں اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون و نظم کا احترام پیدا کرنے کیلئے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک '' تقتیل '' کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ گنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کی عزت و ناموس کیلئے خطرہ بن جائیں، جو زنا اور اغوا کو پیشہ بنا لیں، جو دن

دیہاڑے لوگوں کی عزت وآبرو پر ڈاکے ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کیلئے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔ رجم کے باب میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے درمیان ہماری فقہ میں جو فرق کیا گیا ہے اس پر ان شاء اللہ ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔" [تفسیر تدبر قرآن: ۲/ ۲۷۷، ۲۷۸، سورۃ المائدۃ]

محاربہ کی اس تعریف کی رو سے یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ حضرت ماعز بن مالک اور غامدیہ کا جرم زنا (جو صرف بشری غلطی کا نتیجہ تھا) ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے اللہ ورسول ﷺ کا قائم کردہ نظام عدل وحق درہم برہم اور لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب تک اس کے دلائل فراہم نہیں کیے جائیں گے، محض اصلاحی صاحب کے ان جلیل القدر صحابی وصحابیہ کو غنڈہ، بدمعاش اور پیشہ ور کہنے سے نعوذ باللہ ان کو ایسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ بلا دلیل اپنے مفروضات کو ثابت کرنے کیلئے ان کو ایسا سمجھنا اور ان کو محاربہ کا مصداق قرار دینا، قصر صحابیت میں ایسی نقب زنی ہے جس کا ارتکاب روافض کی طرف سے تو کیا جاتا ہے لیکن فراہی واصلاحی و غامدی گروہ کی طرف سے اس کا ارتکاب نہایت عجیب ہے!

اصلاحی صاحب کی تعریف کی رو سے محاربہ میں جتھہ بندی ضروری ہے، کوئی شخص کتنا بھی گناہگار ہو، بیشک تسلسل سے اللہ کی نافرمانی کرتا ہو لیکن اس کے جرائم یا حدود شکنی سے نہ نظام عدل وحق درہم برہم ہوتا ہے اور نہ لا آینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایسا تب ہی ہوتا ہے جب کوئی منظم گروہ، کوئی جتھہ ایسی کوشش کرے، اس کے پاس اس قسم کے خطرناک وسائل ہوں جو بالعموم حکومتوں کے پاس ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ نہ کسی نظم کو چیلنج کر سکتے ہیں اور نہ اسے درہم برہم کر سکتے ہیں۔ کیا مذکورہ صحابہ وصحابیات ایسا ہی منظم جتھہ تھا اور ان کے پاس خطرناک وسائل موجود تھے؟ اس کا ثبوت بھی ضروری ہے۔ محض فراہی گروہ کے انہیں غنڈہ کہنے سے وہ غنڈے اور پیشہ ور زانی قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

محاربہ کے مفہوم میں جتھہ بندی ضروری ہے یا نہیں، اس کی وضاحت بھی خود اصلاحی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ فرماتے ہیں: "اس طرح کے حالات میں صرف اسی امر کو ملحوظ رکھنا پڑتا کہ جرم کرنے والے جتھے نے صرف مال کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر زمانہ، مقام اور جتھہ بندی کرنے والے مجرموں کے عزائم اور ان کے اثرات پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔

مثلاً: زمانہ جنگ یا بدامنی کا ہو تو اس میں لازماً سخت اقدام کی ضرورت ہوگی۔ اسی طرح مقام سرحدی یا دشمن کی سازشوں کا آماجگاہ ہو تب بھی مؤثر کاروائی ضروری ہوگی۔ اگر شرارت کا سرغنہ کوئی بڑا خطرناک آدمی ہو اور اندیشہ ہو کہ اس کو ڈھیل ملی تو بہتوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ پیش آجائے گا، تب بھی حالات کے لحاظ سے مؤثر قدم اُٹھانا پڑے گا۔ غرض اس میں اصلی اہمیت جزوی واقعات کی نہیں بلکہ بغاوت کے مجموعی اثر اور ملک وملت کے مصالح کی ہے۔ اس طرح کے حالات میں سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ گروہی حیثیت سے دی جائے گی۔'' [ص: ۲۷۸، ۲۷۹] یہ پوری عبارت اللہ تعالیٰ نے اصلاحی صاحب سے لکھوائی تا کہ مذکورہ صحابی وصحابیہ اصلاحی صاحب کے علی الرغم محاربہ کے جرم سے خود ان کے قلم سے بری ثابت ہوجائیں جن کو سراسر تحکم اور دھاندلی سے اس جرم کا مصداق قرار دینے کی ناپاک کوشش اس پورے گروہ کی طرف سے کی جارہی ہے۔ **نعوذ باللہ من هذه الجسارة العظيمة!**

مذکورہ تشریح کی روشنی میں پوچھا جاسکتا ہے کہ حضرت ماعز کا کون ساجتھہ تھا، حضرت غامدیہ کا کون ساجتھا تھا جو مدینے کے امن اور نظم کو اور اسلام کے نظام عدل وحق کو برباد اور درہم برہم کر رہا تھا؟ **ھاتوا برھانكم ان كنتم صادقين!**

ایک اور کذب صریح یا عظیم مغالطہ:

اصلاحی صاحب نے مذکورہ بالا اقتباس میں شادی شدہ اور غیر شادی زانیوں کے درمیان سزا میں فرق کو ''فقہ'' کی کارستانی قرار دیتے ہوئے کہا ہے اس پر ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔ [ص: ۲۷۸] حالانکہ رجم کے باب میں یہ فرق ''فقہ'' میں نہیں بیان کیا گیا ہے کہ اسے ''فقہاء'' کی ایجاد قرار دیا جاسکے (جیسا کہ فقہ کی طرف اسے منسوب کرنے کا مقصد و مدعا ہے جو ایک کذب صریح یا عظیم مغالطہ ہے) بلکہ یہ فرق صحیح وقوی متفق علیہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے، احادیث بھی اخبار آحاد نہیں بلکہ متواتر اور تین درجن صحابہ سے مروی ہیں۔ اور الحمد للہ سورۂ نور کی اس تفصیلی بحث کا ہم مدلل جواب اصلاحی صاحب کی زندگی (۱۹۸۱ء) ہی میں دے چکے ہیں جس کا جواب آج تک نہیں دیا جاسکا ہے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ گروہ ان شاءاللہ قیامت تک اس کا جواب نہیں دے سکے گا ﴿**و لو كان بعضهم لبعض ظهيرا**﴾ (جاری ہے)